© rasailojaraid.com

سید محمد متین ہاشمی

بارِ امانت

دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری (لاہور) کے ریسرچ سیل میں عرصہ تین سال سے یہ معمول رہا ہے کہ ہر اتوار کو نو بجے صبح لائبریری کے چیئرمین جناب کرنل (ریٹائرڈ) خواجہ عبدالرشید صاحب تشریف لاتے ہیں اور سیل کے سٹاف کے علاوہ لاہور کے چند اہلِ علم حضرات بھی اکثر و بیشتر جمع ہو جاتے ہیں۔ میر مجلس کے فرائض کرنل صاحب موصوف ہی انجام دیتے ہیں۔ تین چار گھنٹے مختلف قرآنی آیات اور دیگر اہم علمی فلسفیانہ مسائل پر بحث ہوتی ہے اور کوئی نہ کوئی بات بحث و تمحیص کے بعد منقح طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ اب یہ مجلس جمعرات کو ہونے لگی ہے۔

جمعرات کا یہ اجتماع اگرچہ مختصر ہوتا ہے مگر اہلِ علم کے جمع ہو جانے کی وجہ سے اس میں افادیت کے کئی پہلو نکل آتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ ہر شخص سود و زیاں کی فکر میں سرگرداں ہے۔ چند دردمند اور پُرخلوص افراد کا جمع ہو کر قرآنی حکمت پر غور و فکر کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔

ایک دفعہ یہ آیتِ کریمہ زیرِ بحث آئی:

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا (الاحزاب: ۷۲)

ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی۔ سو ان سب نے انکار کیا اس سے کہ اُسے اُٹھائیں اور وہ اس سے ڈرے اور اُسے انسان نے اپنے ذمہ لے لیا، بے شک وہ بڑا ظالم ہے، بڑا جاہل ہے۔

لفظ امانت کے معنی میں اختلاف ہے۔ امام راغب نے اپنی لغت میں دو معانی لکھے ہیں۔ ایک توحید کے دوسرے عقل کے۔ لیکن ترجیح انھوں نے دوسرے معنی ہی کو دی ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وبہ فضل علی کثیر ممن خلقہ

اسی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی اکثر مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے ۔

تفسیر ابنِ کثیر میں حضرت ابنِ عباس سے مروی ہے کہ امانت سے مراد طاعت ہے :

عن ابن عباس یعنی بالامانۃ الطاعۃ عرضھا علیھم قبل ان یعرض علیٰ آدم فلم یطقنھا [1]

حضرت ابن عباس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ امانت سے طاعت مراد لیا کرتے تھے جسے اللہ تعالیٰ نے (آدم پر) پیش کرنے سے پہلے آسمان، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا لیکن ان میں اس کے اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی

ابنِ کثیر نے مجاہد، سعید بن جبیر، ضحاک اور حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک امانت سے مراد "فرائض" تھے [2] قتادہ امانت سے مراد "دین" "فرائض" اور "حدود" سے لیتے تھے [3]

قرطبی نے لکھا ہے کہ امانت سے مراد "جملہ وظائف دینیہ" ہیں :

والامانۃ تعم جمیع وظائف الدین علی الصحیح من الاقوال وھو قول الجمھور

امانت صحیح قول کے مطابق جملہ وظائف دینیہ کو محتوی اور یہی جمہور کا قول ہے ۔

علامہ ابن جریر طبری نے مختلف معانی بیان کرنے کے بعد امانت کو اس کے عمومی مفہوم میں لینے کو ترجیح دی ہے ۔

واولی الاقوال فی ذالک بالصواب ...... جمیع معانی الامانات فی الدین وامانات الناس [5]

---

[1] حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر: تفسیر القرآن العظیم، ۳ : ۵۲۲ ۔ سہیل اکیڈمی، لاہور ۱۹۷۳ء

[2] ایضاً [3] ایضاً

[4] القرطبی، محمد بن احمد انصاری : ۱۳ : ۲۵۳ ۔ طبع قاہرہ ۱۹۶۷ء

[5] الطبری، ابوجعفر محمد بن جریر : ۲۲ : ۵۷ ۔ مصر ۱۹۵۴ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سب سے زیادہ قرین صواب قول اس باب میں وہ ہے جو دینی اور انسانی امانات کے تمام مفاہیم کو متضمن ہو۔ اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت کریمہ میں صرف لفظ الامانۃ استعمال فرمایا ہے اور امانت کے کسی خاص معنی کی تخصیص نہیں فرمائی۔ سو ہمارے لیے یہ روا نہیں ہے کہ اپنے تجویز کردہ مفہوم کو اس پر لاگو کریں۔[۵۶]

شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن عربی نے "عرض امانت" کے دو معانی بتلائے ہیں۔ ایک تو:

ای اع حقیقۃ الھویۃ[۵۷]

ذات بحت کی ہویت کی حقیقت کا ودیعت کیا جانا۔

دوسرے تجلی کے:

او عرضنا الامانۃ الالٰھیۃ بالتجلی علیھا[۵۸]

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس آیت پر ذرا تفصیل سے بحث کی ہے جس کا خلاصہ انشاء اللہ آئندہ صفحات میں آ جائے گا۔ اس وقت صرف لفظ امانت سے متعلق عبارت پیشِ خدمت ہے۔

الامانۃ ای التکلیف وھو الامر بخلاف مافی الطبیعۃ[۵۹]

امانت سے مراد "تکلیف (مکلف بنانا)" ہے یعنی ایسے کام کرنے کا حکم دینا جو طبیعت کے خلاف ہو۔

استاذ احمد مصطفیٰ المراغی نے "تکلیف" کے معنی کو صرف امورِ دینیہ تک محدود مانا ہے۔

والمراد بھا ھنا التکالیف الدینیۃ[۶۰]

حضرت خواجہ عبداللہ انصاریؒ نے تمام مفسرین کی ڈگر سے ہٹ کر ایک الگ ہی انداز اختیار کیا

---

۵۶ الطبری ابو جعفر محمد بن جریر۔ ۲۲ : ۵۷۔ مصر ۱۹۵۴

۵۷ ابنِ عربی علامہ محی الدین۔ تفسیر القرآن الکریم۔ ۲ : ۲۹۸۔ بیروت ۵۸ ایضاً بعد

۵۹ الفخر الرازی : التفسیر الکبیر۔ ۲۵ : ۲۳۴۔ طبع اول جامع ازہر مصر

۶۰ المراغی : تفسیر المراغی۔ ۲۲ : ۴۵۔ مصر

© rasailojaraid.com

کیا ہے۔ وہ امانت کو "مُہرِ مِہر" کہتے ہیں۔ اور آدم کو "آں سالکِ اوّل" "چشمہ لطفِ ازل"، "آں صندوقِ عجوبہ ہائے قدرت"، کے لقب سے یاد فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"آں مہجورِ لعین (ابلیس) از آدم گل دید و دل ندید صورت دید صفت ندید ظاہر دید باطن ندید هرگز بر آتش مهر نتواں نهاد بلکه مُهر بر خاک تواں نهاد که خاک مهر گیر است و آتش مهر سوز۔ ما آدم را که از خاک و گلِ در وجود آوردیم حکمت در آں بود که تا مهر امانت بر گل دل او نهیم۔ خداوند مشتی گل و خاک در وجود آورد و به آتش محبت بسوخت پس او را بر بساط انبساط جای دلو آگاه به عنوان امانت بر عالم صورت عرضه داشت آسمان ها و زمین و کوه ها همه سر در اندند آدم مردانه پیش آمد[11]

آگے چل کر فرماتے ہیں:

"ای جواں مرد از روز الست امانتی نزد تو گذارد ند و مهر بلی بر او نهادند چوں عمر به آخر رسد و تو را به سرای خاک برند فرشته ای در آید و گوید من خدائے تو کیست؟" درحقیقت مطالعہ و معاینه می کند که ببیند مهر بر جای خود هست یا نه؟ و گوید ایں مسکین از فرق تا قدم تو مهر نهاده اند و بداں که مُهر از مِهر باشد زیرا مهر آں جا نهند که مهر در آں جا دارند۔ ای دل سوخته که بر تو مُهر ما است! تو مرا و من تو را؟[12]

حضرت مجدد الف ثانی کی تحقیق میں "امانت سے مراد تجلی ذاتی کی استعداد و قابلیت ہے۔ جنات عبادت سے صالح بن جاتے ہیں اور ملائکہ عصمت سے مقرب ہیں مگر انوارِ صفات سے صعود کر کے تجلی ذات سے یہ دونوں اصناف کبھی مشرف نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ تحمل نور ممکن نہیں بغیر ترکیب عنصرِ خاک کے۔ قیام انوار یہی نکتہ ہے کہ خلافت دنیوی کے قابل عنصر خاک ہی قرار پایا[13]

---

[11] عبداللہ انصاری خواجہ: تفسیر ادبی و عرفانی - ۱: ۲۶۵ - تہران ۱۳۵۲ھ

[12] ایضاً بعد

[13] بحوالہ تفسیر ماجدی - ۲ : ۸۵۸ - تاج کمپنی لاہور -

© rasailojaraid.com

غالب نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے،

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے الامانۃ کا ترجمہ استعداد تکلیف بہ اوامر و نواہی کیا ہے [۱۴]

علامہ اقبال نے الامانۃ سے مراد آزاد شخصیت لی ہے۔ وہ انسان کی انفرادیت اور یکتائی کو قرآنِ کریم کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"انسان ایک آزاد شخصیت کا امین ہے، جیسے اس نے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر قبول کیا ہے" [۱۵]

اس کے بعد علامہ نے محولہ بالا آیت اور اس کا انگریزی ترجمہ درج فرمایا ہے۔

کرنل عبدالرشید صاحب نے علامہ اقبال کی رائے سے اتفاق فرماتے ہوئے مندرجہ ذیل دلائل دیے۔

"علامہ اقبال کا یہ کہنا کہ امانت "آزاد شخصیت" (FREE PERSONALITY) بالکل درست ہے اور اس میں تمام جواب مضمر ہے۔ یہ اس لیے کہ انسان آزاد اور اپنے افعال کا ذمے دار ہے مخلوقات میں سمتیں جتنی زیادہ ہوتی ہیں ان میں اختیار بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور اپنے اعمال کا ذمے دار ہوتا ہے۔ اس میں (دوسروں کی بہ نسبت) اعتماد زیادہ ہوتا ہے اور وہ خراب وہ بنتا ہے۔ پہاڑوں کی مثال درختوں جیسی ہے۔ یہ یک سمتی (ONE DIMANSIONED) مخلوق ہے۔ یہ ہر وقت سجدے میں مصروف اور حرکت سے محروم ہے۔ ان میں اگر حرکت ہے بھی تو یک سمتی۔ اگرچہ یہ چل پھر نہیں سکتے مگر ان میں حیات ہے اور چونکہ حرکت سے محروم اور بے اختیار ہیں اس لیے وہ لائحہ عمل جو خالق کے منشا میں ہے، یہ بروئے کار نہیں لا سکتے۔

۱۴۔ شاہ ولی اللہ: فتح الرحمٰن، ۲۹۳، طبع ۱۲۸۴ھ

۱۵۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، اردو ترجمہ سید نذیر نیازی، ص ۴۰

© rasailojaraid.com

اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں فرمایا: وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ - (اور ہم نے انسان کو بہت سی مخلوقات پر فضیلت بخشی ہے) - پہاڑوں، آسمانوں اور زمین میں اختیار ہی نہیں ہے تو عمل کیسے کرتے، اس لیے انکار کر دیا - چونکہ انسان کو شعور تھا کہ وہ عمل درآمد کر سکے گا، اس لیے یہ ذمے داری قبول کر لی - اور یہی ذمے داری اصل "امانت" ہے، اس لیے وہ اپنے کردار کا مالک ہے جس سے پہلوتہی کی خاطر وہ قسمت اور تقدیر کا سہارا لیتا اور پتھر اور پہاڑوں سے بھی بدتر ہو گیا ہے - وہ ہاتھ پھیلا کر ہر وقت مانگتا تو رہتا ہے۔ آمین ثم آمین کا ورد تو کرتا رہتا ہے لیکن ہاتھ جوڑ کر نہ تو کبھی توبہ کرتا ہے اور نہ رجوع ہی کرتا ہے - حالانکہ زندگی کی کامیابی سعی میں ہے۔ قرآن میں واضح الفاظ میں موجود ہے: لیس للانسان الا ما سعیٰ - (انسان کو وہی کچھ ملے گا جس کی وہ سعی کرے گا) - آج مغربی دنیا اس پر عامل ہے اور ترقی کر رہی ہے - مگر نہ تو ہاتھ کھول کر مانگتی ہے اور نہ ہاتھ جوڑ کر رجوع کرتی ہے - ہندو ہاتھ جوڑ کر مانگتا ہے - اور مسلمان بے چارے کا حال یہ ہے کہ نہ تو سعی کرتا ہے اور نہ توبہ، صرف مانگتا ہی رہتا ہے اس لیے ترقی سے دور ہے -

لفظ امانت کی مذکورہ بالا تشریحات کو پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ قارئین کرام کے سامنے مختلف نقطہ ہائے نظر آجائیں - یہ تو کلام الٰہی ہے جس کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِن شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِن بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمَاتُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (لقمان: ۲۷)

اور جتنے درخت روئے زمین پر ہیں اگر ان سب کے قلم بن جائیں اور موجودہ سمندر کی سیاہی ہو اور اس سمندر کے علاوہ اس میں اور سات سمندر شامل ہو جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی کمال قوت اور کمال حکمت کا مالک ہے۔

لہٰذا بھلا کس انسان کے بس میں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کی کما حقہٗ تشریح کر سکے - ہر شخص نے اپنے زاویۂ نظر کے مطابق لفظ "امانت" کا مفہوم بیان کیا ہے اس لیے کسی بھی مفہوم کی مطلق تردید نہیں کی جا سکتی، یہ تو قرآن کا اعجاز ہے کہ ہر شخص اپنی بساط اور استعداد کے مطابق اس

© rasailojaraid.com

کے بحرِ ناپیدا کنار میں غواصی کے بعد موتی نکالتا اور اپنے دَور کے تقاضوں کے مطابق اس کی تعبیرات پیش کرتا ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنِ کریم کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ :

لا ینقضی عجائبہٗ[۱۶]

اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔

راقم الحروف کے خیال میں سب سے زیادہ قریب الفہم معنی "مکلّف" ہونے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق اپنی جبلّت کے تابع ہے۔ فرشتوں سے گناہ کا صدور ممکن نہیں کہ وہ مجبول علی الخیر ہیں۔ شیاطین سے خیر کا صدور ممکن نہیں کہ وہ مجبول علی الشر ہیں۔ اسی طرح جمادات، حیوانات، نباتات اور حجرآت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان تمام اشیا کو ان کے اپنے ارادے اور اختیار سے محروم رکھا ہے۔ ایک انسان ہی ہے جسے اپنی پسند کی آزادی دی گئی ہے۔ اسی لیے وہ عذاب و ثواب اور نیابتِ الٰہی کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ "مکلّف ہونا" ہی انسان کا ممتاز وصف ہے اور یہی امانت تھی جسے قبول کرنے سے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے انکار کر دیا تھا۔

انکار کی نوعیت

آیتِ کریمہ پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیشِ نظر ہونی چاہیے کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر جو امانت پیش کی گئی تھی اسے قبول کرنے کا انھیں حکم نہیں دیا گیا تھا بلکہ قبول و عدمِ قبول کا انھیں اختیار تھا اس لیے ان کے انکار کی وہ نوعیت نہیں ہوتی جو ابلیس کے انکار کی ہوتی تھی۔ یعنی ان کا انکار معصیت نہیں بنا۔ ابلیس اور آسمانوں کے انکار میں ایک اور بہت بڑا فرق ہے۔ وہ یہ کہ ابلیس نے فخر و تکبر کی وجہ سے سجدے سے انکار کیا تھا جبکہ آسمانوں نے احساسِ عجز کی وجہ سے انکار کیا اور آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ عجز و انکسار اور تذلل و ندامت کو بارگاہِ ربوبیت میں سب سے زیادہ پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ آیتِ کریمہ کا لفظ وَاَشْفَقْنَ مِنْھَا (اور وہ اس سے ڈر گئے)، ان کے احساسِ عجز پر دال ہے۔

---

۱۶ التبریزی، شیخ ولی الدین: مشکوٰۃ المصابیح ۱ : ۱، ۶۶۱ھ دمشق۔

© rasailojaraid.com

انکار و قبول

رہا یہ سوال کہ آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے کیوں انکار کیا اور انسان نے یہ بارِ امانت کیوں اٹھالیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب بارِ امانت ان کے اوپر پیش کیا گیا تو انھوں نے اپنی استعداد و صلاحیت پر نگاہ ڈالی اور اسے ناکافی پاکر اٹھانے سے انکار کر دیا - اس کے برخلاف انسان نے بارِ امانت کے پیش کرنے والے کو دیکھا اور اس کی بے پایاں قدرتوں کا مشاہدہ کیا اور اس نے یہ محسوس کیا کہ پیش کرنے والا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں اس بارِ امانت کو اٹھا سکوں گا یا نہیں - لہٰذا جب وہ دے رہا ہے تو اُسے اٹھانے اور اپنے فرض کو نبھانے کی طاقت بھی وہی بخشے گا۔

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہو گا ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہو گا
جو کچھ ہوا ہوا کرم سے تیرے جو کچھ ہو گا تیرے کرم سے ہو گا

اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کا یہی مفہوم ہے۔

دو سوال

جناب کرنل عبدالرشید صاحب نے اس مقام پر دو سوال اُٹھائے - پہلا سوال یہ تھا کہ "آسمان زمین اور پہاڑ تو غیر ذی روح ہیں لہٰذا ان پر عرضِ امانت کیوں کر ہوا؟ دوسرے یہ کہ اگر وہ بارِ امانت اٹھا لیتے تو عائد شدہ فرائض کو کس طرح ادا کرتے؟

پہلے سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ " جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام مخلوقات از قسم جمادات و نباتات میں زندگی اور احساس پوری طرح موجود ہے اور یہ بات زمانۂ قدیم سے تسلیم شدہ ہے کہ " افلاک " ہی عقول کے مراکز ہیں -

دوسرا جواب وہ ہے جو امام رازی نے تفسیر کبیر میں دیا ہے کہ :

" سماوات، ارض اور جبال سے مراد اھل السموات و اھل الارض و اھل الجبال ہیں ۔ یعنی انسان کے سوا سماوات، ارض اور جبال میں جو بھی مخلوقات از قسم ملائکہ، جن، حیوانات و حجروات تھیں ان پر امانت پیش کی گئی تھی - اور انھوں نے اُسے اٹھانے سے انکار کر دیا -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہی یہ بات کہ سماواتِ ارض اور جبال ہی کا تذکرہ کیوں کیا گیا؟ تو اس کی وجہ ان کی ظاہری قوت و عظمت ہے لیکن اس کو کیا کیجیے کہ باوجود ظاہری شدت و صلابت کے "بارِ امانت" کا اٹھانا ان کے بس سے باہر تھا جسے انسان نے اپنے ضعف و ناتوانی کے باوجود اٹھالیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند (حافظ)

میرؔ نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے:

سب پہ جس بار نے گرانی کی اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

کرنل صاحب کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ

"اگر بالغرض آسمان، زمین اور پہاڑوں نے بارِ امانت کو اٹھالیا ہوتا تو انھیں بھی انسان کی طرح جبلت کی قید سے نکال کر اختیار پسندیدگی دیا جاتا۔ اس وقت تو وہ اپنی جبلت کے تابع ہیں اس وقت دو راستوں اور دو اعمال کے درمیان انتخاب کرنے کی ان میں صلاحیت پیدا کر دی جاتی (جو اس وقت انسان کو حاصل ہے) اور پھر وہ فرائض مفوّضہ کو ایک آزاد شخصیت کی طرح انجام دیتے اور مرضیاتِ الٰہیہ پر عمل کرنے سے انھیں جزائے خیر اور منہیات کے ارتکاب پر سزا ملتی، جس کے تصور ہی سے وہ کانپ اُٹھے اور انھوں نے معذرت کر دی۔

ظلوماً جہولا

لغت میں ظلم کہتے ہیں وضع الشیئ فی غیر موضعہ[۱۸] کو یعنی کسی شی کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کا محل نہ ہو۔ اور جہل علم و معرفت کی ضد ہے۔ اس کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے لکھا ہے

"یعنی بالفعل عدالت و علم وندارد و قابلیت آنہا دارد"[۱۹]

۱۷؎ الرازی: التفسیر الکبیر: ۲۵: ۲۳۵

۱۸؎ البستانی: محیط المحیط: ۲: ۱۳۱۸

۱۹؎ شاہ ولی اللہ: فتح الرحمٰن: ۵۹۳

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مطلب یہی ہے کہ انسان نے اپنی کمزوریوں کا پوری طرح اندازہ نہ لگایا اور اپنی ذات پر ایک بارِ عظیم لاد لیا۔ جس کی ادائیگی میں کوتاہی کی وجہ سے وہ عذاب کا مستحق ٹھہرا اور چونکہ "حملِ امانت" کے وقت اس نے نتائج و عواقب کی پروا نہ کی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے "جہولاً" کے لقب سے یاد کیا۔

اس کے بعد والی آیت کا اختتامیہ مطلب کو اور زیادہ واضح کر دیتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيمًا

اور اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

یعنی ظلوم انسان کے لیے غفور اور جہول کے لیے رحیم ہے۔ گویا انسان نے اللہ تعالیٰ کے غفران و رحمت کو دیکھ کر باوجود ظلم و جہل کے بارِ امانت اٹھا لیا اس خیال سے کہ

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے ۔۔۔ مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

اسے یقین تھا کہ "غفور و رحیم ساقی" "ظلوم و جہول" کو ضرور تھام لے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

ملفوظاتِ رومی

عبدالرشید تبسم

(مولانا جلال الدین رومی کی "فیہ ما فیہ" کا اردو ترجمہ: طبع دوم)

"فیہ ما فیہ" کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ مولانا روم کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو آپ کے صاحبزادے سلطان بہاء الدین نے آپ کی مختلف مجالس میں محفوظ کیے۔ "مثنوی" اور "دیوان شمس تبریزؒ" کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

صفحات ۳۶۴ ۔۔۔ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ - لاہور

© rasailojaraid.com